© rasailojaraid.com

شیخ المجاہدین مفتیٔ اعظم فلسطین رحمۃ اللہ علیہ

ایک عہد کی داستان

خلیل حامدی

۴ جولائی ۱۹۷۴ء کو الحاج محمد امین الحسینی مفتیٔ اعظم فلسطین انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون مفتی صاحب کے اٹھ جانے سے نہ صرف تاریخ فلسطین کا ایک باب ختم ہو گیا بلکہ عالم اسلام کے اس دور کی داستان بھی آخر ہو گئی جسے جمال الدین افغانی مرحوم، علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ اور امیر شکیب ارسلان نے شروع کیا تھا۔ مرحوم نے عنفوانِ شباب ہی میں جہاد و اتحاد کے لیے جو شمشیر اٹھائی تھی، وہ برابر اٹھی رہی اور صرف اس وقت نیام میں واپس داخل ہوئی جب بیروت کے امریکن اسپتال میں مرحوم نے جان، جانِ آفریں کے حوالے کر دی۔ مفتی صاحب نے اپنی زندگی جس ہمہ پہلو جد وجہد میں کھپائی ہے اس کا ذکر ایک حکایتِ طویل اور حدیثِ ذو شجون ہے۔ ایک مضمون اس کے لیے ناکافی ہے۔ وہ ایک عالمِ دین تھے اور علمِ دین کے ساتھ حکمتِ دین سے بھی بہرہ مند تھے۔ وہ ایک مجاہد تھے، قائدانہ صفات سے بھی متصف اور سپاہیانہ جذبۂ ایمان سے بھی سرشار۔ وہ ایک تحریکی انسان تھے، تحریک ساز بھی اور تحریک نواز بھی۔ وہ اہل قلم تھے، الفاظ کے موتی بھی پروتے تھے اور دل صد پارہ کی قاشیں بھی اہلِ دل کو پیش کرتے تھے۔ وہ ایک خطیبِ لبیب تھے اور تقریر کو تاثیر سے الگ نہ ہونے دیتے تھے۔ وہ بہترین انسانی اخلاق کا پیکر تھے۔ تواضع، ملنساری، مہمان نوازی، شفقت و محبت، ضعفاء اور مساکین سے ہمدردی اور کرم و سخاوت میں ان جیسی مثالیں دنیا میں کم ہی ملتی ہیں ــــ وہ خود بھی بے بہا خوبیوں کے مالک تھے اور دنیا میں بھی جہاں کہیں کوئی ایسا انسان انہیں نظر آیا جو مسلمانوں کے لیے مخلص اور اسلام کے لیے دل میں تڑپ رکھتا تھا اس کے بھی وہ تادمِ آخر گرویدہ رہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مفتی صاحب مرحوم ۱۸۹۷ء میں بیت المقدس میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم بیت المقدس ہی میں پائی۔ جدید علوم کے ساتھ اسلامی علوم اور عربی اور فرانسیسی زبانوں میں دستگاہ حاصل کی۔ پھر مصر چلے گئے اور ازہر یونیورسٹی میں داخل ہوگئے۔ اور تلاشِ علم صرف ازہر کی چار دیواری تک ہی محدود نہ رکھی بلکہ اسی زمانے میں وہ سید رشید رضا کی مجلسوں میں بھی شرکت کرتے رہے۔ اور مصری یونیورسٹی (موجودہ قاہرہ یونیورسٹی) کے آرٹس کالج میں بھی پابندی سے لیکچر سنتے رہے اور عمرانی علوم میں مدرک حاصل کرتے رہے۔ طبیعت میں جستجو اور پرواز کا مادہ وافر موجود تھا۔ اس لیے مصر میں تعلیمی عرصہ کے دوران تعلیمی فضا سے نکل کر عام اہلِ علم کی مجلسوں میں شرکت بھی کرتے رہے۔ اس دور میں مصر کے تمام نمایاں رہنماؤں اور اہل ادب ولغت اور اربابِ دعوت وعزیمت کے ساتھ انہوں نے اپنے تعلقات استوار کرلیے۔ اور ان کی صحبتوں سے بھرپور استفادہ کیا۔ امت عرب اور عالم اسلامی کے حالات پر ان سے تبادلۂ خیالات کرتے رہتے اور ان کی بیداری اور ترقی اور استعمار سے نجات کے راستے سوچتے رہے۔ ان میں مصر کے قومی لیڈر سعد زغلول پاشا بھی تھے اور مصطفیٰ لطفی منفلوطی جیسے ادیب وانشاء پرداز بھی۔ اُن دنوں ازہر نہ صرف ایک تعلیمی درسگاہ تھی بلکہ جہاد وحریت کا ایک فعال مرکز تھا۔ مرحوم نے ازہر میں جو تربیت پائی اُس کا خلاصہ خود اُن کی زبان میں یہ ہے کہ "اسلام جہاد سے عبارت ہے اور جہاد کے بغیر کوئی قوم عزت وغیرت کے ساتھ دنیا میں زندہ نہیں رہ سکتی" چنانچہ ازہر سے فارغ ہوکر فلسطین واپس آئے۔ مگر فلسطین میں زیادہ دیر تک قیام نہ کرسکے بلکہ جذبۂ جہاد اور شوق قتال کے تحت وہ استنبول چلے گئے اور عثمانیہ ملٹری کالج میں داخلہ لیا۔ تاکہ اُصول حرب وضرب سے واقفیت حاصل کریں، اور علم وجہاد اور سیف وقلم دونوں کے جامع بنیں۔ یہ پہلی جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ موصوف نے ملٹری کالج سے تربیت پاکر عثمانی فوج میں شرکت کی اور ایک فوجی عہدے پر فائز ہوگئے اور صوبہ ازمیر (سمرنا) میں عثمانی فوج کے ۴۶ ویں ڈویژن میں شامل ہوگئے۔ موصوف کچھ عرصہ تک اِزمیر یونیورسٹی کے مذہبی امور تدریس وتربیت سرانجام دیتے رہے اور اپنی پاکیزہ اور بھرپور جوانی کو دعوت وجہاد دونوں ضرورتوں کے لیے تیار کرتے رہے۔

جب پہلی جنگ عظیم ختم ہوئی تو مفتی صاحب مرحوم استنبول سے فلسطین پہنچے۔ ترکی میں انہوں نے نہ صرف جنگی تربیت حاصل کرلی تھی بلکہ خلافت عثمانیہ کے مرکز میں رہ کر انہیں عالمی سیاست کے انداز بھی سمجھنے کا موقع ملا۔ اور خاص طور پر انہیں یہ اندازہ ہوگیا کہ انگریزوں اور یہودیوں کی ملی بھگت کس طرح

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فلسطین کو عربوں سے چھیننا چاہتی ہے اور اس غرض کے لیے کیا کیا سازشیں تیار کی جا رہی ہیں۔ خود عثمانی خلافت کے خاتمے کے لیے یہودی جو ریشہ دوانیاں کر رہے ہیں اُن کے بعض پہلو بھی مفتی صاحب کے علم میں آئے۔ ان معلومات کو لے کر مفتی صاحب اپنے وطن فلسطین کو لوٹے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب فلسطین دو عظیم فتنوں سے دوچار ہوا۔ ایک لارڈ بلفور کے ڈیکلیریشن کا اعلان جو نومبر ۱۹۱۷ء کو صادر ہوا۔ اس ڈیکلریشن کی رُو سے برطانیہ نے فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن قرار دے دیا۔ جو گویا آگے چل کر فلسطین کے اندر یہودیوں کی باقاعدہ ریاست قائم کر دینے کی تمہید تھی۔ نامور یہودی مصنّف آرتھر کوسٹلر کے الفاظ میں اس ڈیکلریشن کی حقیقت یہ تھی کہ "ایک قوم نے ایک دوسری قوم کو ایک ایسی سرزمین بخش دینے کا پروانہ دے دیا جو ایک تیسری قوم کی ملکیّت تھی"۔

دوسرا فتنہ جس سے مفتی صاحب مرحوم یکایک دوچار ہوئے وہ فلسطین پر انگریزی انتداب کا تھا۔ ۱۹۱۷ء میں انگریزی فوج پہلی مرتبہ عرب فوجوں کی مدد سے فلسطین میں داخل ہوئی تھی۔ کیونکہ عرب فوجیں ترکی کے مقابلے میں برطانیہ کی حلیف بن چکی تھیں اور اس کے عوض وہ برطانیہ کی مدد سے عرب ممالک کی آزادی اور وحدت کے خواب دیکھ رہی تھیں۔ مگر برطانوی استعمار کا یہ وعدہ جھوٹ تھا۔ اور عربوں کا خوابِ استقلال و آزادی سراب تھا۔ انگریزی فوجیں خود فلسطین پر قابض ہو گئیں۔ اور ۱۹۲۲ء میں مجلس اقوام کی طرف سے فلسطین کو باقاعدہ انگریزی انتداب میں دے دیا گیا۔ گویا انگریزی فوج کی سنگینوں کے زیرِ سایہ یہودیوں کے اقتدار کا انتظام کر دیا گیا۔

ان حالات میں مفتی صاحب نے جو کردار ادا کیا ہے وہ اپنے دور کا صحیح تقاضا تھا۔ اور ایک عالمِ دین جو دین کو جہاد و قتال سے عبارت سمجھتا ہو خالی وعظ و تبلیغ پر اکتفا کیسے کر سکتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایک مجاہد اور انقلابی انسان ہونے کی حیثیت سے نئے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے انجمنیں قائم کیں، علمی اور ادبی اداروں کی بنیاد ڈالی اور سیاسی اور ثقافتی تنظیموں کی تشکیل کی۔ اور ان کے ذریعے سے عرب نوجوانوں کے اندر بیداری اور آزادی کی روح پھونکی، برطانوی انتداب اور پروانۂ بلفور کی مزاحمت شروع کر دی۔ اور برطانوی استعمار اور صہیونی سازش کے خلاف آزادیٔ فلسطین کی تحریک برپا کر دی۔ بیت المقدس میں پہلا انقلابی شرارہ اپریل ۱۹۲۰ء کو بھڑکا۔ اس انقلابی شرارے کے قائد مرحوم مفتی محمد امین الحسینی تھے اور اس کے سپاہی بیت المقدس کے نوجوانوں کی ایک جانباز جماعت تھی۔ اور ۲۳ سال کا ایک خوبرو شعلہ بداماں نوجوان انگریزوں اور یہودیوں کے مقابلے میں اپنے ہم عمروں کی ایک مختصر تنظیم لے کر سینہ سپر ہو گیا تھا۔ اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"بغاوت" کے جرم میں اس نوجوان قائد کی گرفتاری کے احکام صادر ہوئے مگر وہ نوجوان استعماری سفاکوں کو طرح دیتا رہا اور ان کی گرفت میں نہ آسکا۔ چنانچہ انگریزوں کی فوجی عدالت کی طرف سے جو اس بغاوت کے اسباب کی تحقیق کے لیے تشکیل دی گئی تھی مفتی صاحب کو دس سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔ مفتی صاحب خفیہ طریقے سے شرق اردن کے قبائل میں پہنچ گئے اور ان کے سربراہوں اور سرداروں سے رابطہ قائم کیا اور انہیں دفاع فلسطین کے لیے متحد کوششوں کے لیے آمادہ کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب شام کو آزادی مل چکی تھی۔ اور شریف حسین کا لڑکا امیر فیصل بن حسین شام کا حاکم مقرر ہو چکا تھا۔ مفتی صاحب مرحوم اس خیال سے شام چلے گئے کہ وہاں کام کے زیادہ مواقع ہوں گے۔ اور زیادہ آزادی کے ساتھ مسئلہ فلسطین کی خدمت کر سکیں گے۔ مگر شام کی یہ آزادی چند روزہ تھی۔ فرانس نے مسلح حملہ کر کے شام پر قبضہ کر لیا اور اس کی آزادی کو ختم کر دیا۔ مفتی صاحب دمشق سے نکل کر شام کے صحرا میں نکل گئے اور عرب قبائل کے اندر تحریک آزادی پھونکتے رہے۔ اسی دوران اُن کے خلاف سزائے قید کا جو حکم صادر ہو چکا تھا وہ منسوخ ہو گیا اور مفتی صاحب دوبارہ فلسطین لوٹ گئے۔

۱۹۲۱ء میں اہل فلسطین نے اس نوجوان مجاہد کی قدردانی کے طور پر اسے فلسطین کی مسندِ افتا سونپ دی۔ اور اُسے قائد جہاد ہی نہیں پیشوائے دین بھی تسلیم کر لیا۔ اس سے پہلے یہ عظیم منصب اُن کے مرحوم بھائی سید محمد کامل الحسینی کے پاس تھا۔ مفتی صاحب مرحوم کی مقبولیت میں روزانہ اضافہ ہو رہا تھا۔ اہل شجاعت اور مشتاقانِ حریت بھی ان کے گرد جمع ہو رہے تھے اور اربابِ صدق وصفا بھی۔ ۱۹۲۲ء میں انہیں فلسطین کی اعلیٰ اسلامی کونسل کا صدر بھی منتخب کر لیا گیا، اور اوقاف کے امور اور شرعی عدالتوں کا نظم ونسق بھی ان کے ہاتھ آگیا۔ ایک طرف ان کے ہاتھ میں شمشیر براں تھی جس سے یہود و انگریز پریشان تھے اور دوسری طرف ان کے سر پہ عمامۂ مشیخت تھا جو اہل فلسطین کے لیے تاج آبرو تھا۔ مفتی صاحب نے اوقاف اور قضائے شرعی کو ہاتھ میں لے کر ان دونوں اداروں کے نظم ونسق کو دوراندیش سیاستدان کی طرح بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کی۔ اور خاص طور پر اوقاف کے لیے ایسے قوانین بنائے جن کی رُو سے اراضی فلسطین کو صہیونیوں کے ہاتھ میں جانے سے روکا۔

مفتی صاحب نے عملی جدوجہد کے ساتھ سیاسی میدان میں بھی اپنی کوششوں کو تیز کر دیا۔ ان کا مدعا انگریزی انتداب کا خاتمہ اور بلفور ڈیکلریشن کے بعد فلسطین میں یہودیوں کی آمد کو روکنا تھا۔ چنانچہ انہوں نے فلسطین کی سطح پر بھی کانفرنسیں منعقد کرنا شروع کر دیں، عالم اسلامی کی سطح پر بھی تحریک کو پھیلانا شروع کر دیا۔ یورپ،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

امریکا اور اسلامی ممالک کے اندر بھی وفود بھیجے۔ اور خود کئی وفود میں شامل ہو کر مصر، عراق، شام، امارات خلیج، ایران، ہندوستان اور افغانستان کا دورہ کیا۔ اور عربی اور اسلامی دنیا کو مسئلہ فلسطین سے روشناس کرایا، اور فلسطین کو یہودی خطرات اور انگریزی استعمار سے نجات دلانے کے لیے ہر ممکن تگ و دو شروع کر دی۔ موصوف کی اس جدوجہد سے مسئلہ فلسطین مقامی حدود سے نکل کر عرب اور اسلامی ممالک تک پہنچ گیا۔ انگریزوں اور یہودیوں کی پالیسی یہ تھی کہ یہ مسئلہ دریائے اُردن کو عبور نہ کرنے پائے مگر مفتی صاحب کی سیمابی شخصیت نے اسے پورے عالم اسلام کا مسئلہ بنا دیا۔ مفتی صاحب کی فعال اور مؤثر شخصیت سے ہراساں ہو کر یہودیوں نے انہیں لالچ کے ذریعے دبانے کی کوشش کی۔ یہودی سمجھتے تھے کہ مفتی صاحب کی متواتر جدوجہد شاید انہیں اپنے عزائم کو شرمندۂ تکمیل کرنے کا موقع نہ دے۔ اس لیے انہوں نے ہر قیمت پر انہیں راستے سے ہٹانے کی کوشش کی۔ چنانچہ ۱۹۲۹ء میں جب فلسطین کے اندر ایک مرتبہ پھر انقلابی رَو اٹھی اور انگریزوں نے پکڑ دھکڑ شروع کی اور تحقیقات کے لیے برطانیہ نے سر والٹر شو کی سربراہی میں تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی۔ مفتی صاحب نے اس کمیٹی کے سامنے دستاویزی ثبوت کے ساتھ یہ بات واضح کی کہ یہودیوں نے مفتی صاحب کو پانچ لاکھ اسٹرلنگ پونڈ رشوت کے طور پر پیش کیے تاکہ مفتی صاحب "براق شریف" (جسے یہودی دیوارِ گریہ کہتے ہیں) کے حقوق سے یہودیوں کے حق میں دستبردار ہو جائیں۔ مفتی صاحب نے نہ صرف اس رشوت کو یہودیوں کے منہ پر دے مارا بلکہ اُن کے ایسے ہتھکنڈوں سے مزید چوکنا ہو گئے۔

۱۹۳۰ء میں فلسطینی نمائندوں کا ایک وفد انگریزوں سے آزادیٔ وطن کی بات چیت کرنے کے لیے لندن گیا۔ مفتی صاحب مرحوم اس وفد کے ایک رکن تھے، اور اس کے صدر مشہور فلسطینی لیڈر مرحوم موسیٰ کاظم الحسینی تھے۔ اس وفد نے مسئلہ فلسطین کے سلسلے میں بڑی سرگرمی سے کام کیا۔ لندن سے یہ وفد سوئٹزرلینڈ آیا۔ اور انتداب کمیٹی کے سکرٹری جنرل سر اریک ڈرومنڈ سے ملا۔ یورپ کے دوسرے متعدد سیاستدانوں سے بھی اس نے ملاقاتیں کیں۔ اور ہر جگہ اپنی مظلومیت کی آواز بلند کی۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے مفتی صاحب نے عالم اسلامی کے اندر بھی اس مسئلہ کو اٹھایا۔ حالانکہ اس وقت اکثر مسلمان ممالک استعماری طاقتوں کے پنجے میں گرفتار تھے۔ اس سلسلے میں بیت المقدس کی اسلامی کانفرنس بڑی شہرت رکھتی ہے۔ یہ کانفرنس ۱۹۳۱ء میں مفتی صاحب نے بیت المقدس میں طلب کی تھی۔ اور دنیائے اسلام کے کونے کونے سے مندوبین شریک ہوئے۔ مسلمان رہنماؤں نے پہلی مرتبہ اس کانفرنس کی بدولت فلسطین میں یہودی عزائم اور استعماری دسیسہ کاریوں کی تفصیلات سے آگاہی حاصل کی۔ یہ کانفرنس

© rasailojaraid.com

۷ دسمبر سے لے کر ۱۷ دسمبر ۱۹۳۱ء تک جاری رہی اس میں بڑے بڑے نمایاں لوگ شریک ہوئے۔ ہندوستان سے علامہ اقبال، مولانا شوکت علی اور مولانا غلام رسول مہر شریک ہوئے۔ ایران سے ایران کے سابق وزیراعظم ضیاءالدین طباطبائی، شیعہ گروہ کے مجتہدِ اعظم سید محمد حسین آل کاشف الغطاء، کاکیشیا کے مجاہدِ اعظم کے پوتے شیخ سعید شامل، شام کے سابق صدر شکری القوتلی، امیر عبدالقادر الجزائری کے پوتے امیر سعید الجزائری، مصر کے نامور پیشوا علامہ سید رشید رضا، بیروت کی اعلیٰ اسلامی کونسل کے صدر نامور مؤرخ ولغت دان مصطفی الغلابینی، چینی رہنما موسیٰ جار اللہ، وسطی افریقہ کے مسلمانوں کے نمائندے کمانڈر طارق نائیجری، لنکا کے زہرا کالج کے پروفیسر مسٹر رؤف پاشا، نامور ترک فلاسفر رضا توفیق اسی طرح یوگوسلاویہ، جاوا، برقہ اور دوسرے ممالک کے مندوبین شریک ہوئے۔ اس کانفرنس کی کامیابی میں تونس کے زعیم شہید عبدالعزیز الثعالبی کی کوشش کو بھی غیر معمولی دخل حاصل ہے۔ الغرض یہ پہلی اسلامی کانفرنس تھی جس نے عالمِ اسلام کے ایک مخصوص مسئلے پر تمام دنیا کے مسلمانوں کی آواز یکجا کر دی۔

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں مفتی صاحب نے نہ صرف آزادیٔ فلسطین کا علم بلند کیے رکھا اور جہاد کو اپنا شعار بنایا بلکہ وہ پوری مسلم ملت کی بہبودی کے لیے سرگرم کار اور مسلمانوں کے اتحاد و یگانگت کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے رہے۔ ۱۹۳۴ء کی بات ہے کہ مملکت سعودیہ اور یمن کی مملکت متوکلیہ کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے اور استعماری غلبے کے بعد دو آزاد مسلمان مملکتوں کے اندر جنگ کا چھڑ جانا بہت افسوسناک اور تباہ کن صورت تھی۔ چنانچہ مفتی صاحب مرحوم نے اسلامی کانفرنس کے صدر ہونے کی حیثیت سے فوری طور پر ایک وفد کی تشکیل کی جس میں شام کے سابق صدر جمہوریہ ہاشم الاتاسی، اس دور کے نامور مسلمان لیڈر امیر شکیب ارسلان اور محمد علی علوبہ پاشا مصر کے ایک وزیر اور مصر کی دستور پارٹی کے سکرٹری جنرل شریک کیے گئے۔ اور خود مفتی صاحب اس وفد کے سربراہ تھے۔ چنانچہ اس وفد نے دو مسلمان اور عرب مملکتوں کے درمیان صلح کی مساعی کا آغاز کر دیا۔ پہلے یہ وفد مملکت سعودیہ گیا اور سلطان عبدالعزیز ابن سعود سے ملا اور انہیں ترکِ جنگ پر آمادہ کیا۔ اور پھر مملکت متوکلیہ (یمن) گیا اور امام حمید الدین یحییٰ سے ملا اور انہیں جنگ سے باز رہنے کی تلقین کی۔ چنانچہ اس وفد کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ باہمی جنگ ختم ہو گئی۔ مسلمانوں کی آپس کی خونریزی بند ہو گئی۔ اور اصلاح ذات البین کی برکت اس قدر پائیدار ثابت ہوئی کہ دونوں مملکتوں کے مابین تعلقات بہتر سے بہتر صورت اختیار کرتے گئے۔ یہ تعلقات ۱۹۶۲ء میں دوبارہ اس وقت متاثر ہوئے جب جمال عبدالناصر کی تدبیر کے تحت یمن میں فوجی انقلاب

© rasailojaraid.com

برپا ہوگیا اور مصری فوج یمن میں داخل ہوگئی۔ موجودہ دور میں ان دونوں مملکتوں کے تعلقات پھر بہتر ہو چکے ہیں)۔

فلسطین کی تاریخ جدید میں سب سے بڑی عوامی بغاوت ۱۹۳۶ء کو بھڑکی۔ اسے فلسطین کی "بغاوت عظمیٰ" کا نام دیا جاتا ہے۔ اس "بغاوت عظمیٰ" کی تدبیر میں مفتی صاحب مرحوم کی حکمت و دانش اور ایمان و عزم کو غیر معمولی دخل حاصل ہے۔ یہ بغاوت پوری فلسطینی قوم کی مشترکہ جدوجہد کی آئینہ دار تھی۔ اس میں دوسری بڑی مجاہد شخصیت شیخ عزّالدین القسّام کی تھی جسے فلسطین میں وہی مقام حاصل ہے جو امیر عبدالقادر الجزائری کو الجزائر کی جنگ آزادی اور امیر عبدالکریم الخطابی کو مراکش میں حاصل ہے۔ "بغاوت عظمیٰ" کے بھڑک جانے پر فلسطینی رہنماؤں نے "اعلیٰ عرب کمیٹی" کے نام سے ایک محاذ قائم کیا۔ مفتی صاحب مرحوم تمام جماعتوں کے کلی اتفاق سے اس کے صدر منتخب کیے گئے۔ اس کمیٹی نے بغاوت کی قیادت کی۔ اس میں ہزاروں فلسطینی نوجوان جام شہادت نوش کر گئے۔ فلسطینیوں نے انگریزوں اور یہودیوں کے چھکے چھڑا دیے۔ پورے چھ ماہ تک یہ بغاوت جاری رہی۔ اور پورے ملک کے اندر چھ ماہ تک عام ہڑتال کی کیفیت رہی۔ اور آخر کار خود عرب سربراہوں کی دخل اندازی کے بعد یہ بغاوت فرو ہوئی۔ سلطان عبدالعزیز ابن سعود، بادشاہ غازی فرمانروائے عراق، امام یحییٰ حمیدالدین امام یمن اور امیر عبداللہ بن حسین امیر شرق اردن نے ایک مشترکہ برقیہ مفتی صاحب مرحوم کو ۸ را کتوبر ۱۹۳۶ء کو بھیجا جس میں ان سے اپیل کی گئی کہ یہ بغاوت ختم کر دی جائے۔ انگریز اس بات پر آمادہ ہیں کہ وہ فلسطین اور اہل فلسطین کے ساتھ پورا پورا انصاف کریں گے (اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!) چنانچہ اس برقیے کی وصولی کے بعد مفتی صاحب نے اعلیٰ عرب کمیٹی کا اجلاس بلایا۔ اور ۱۳ را کتوبر ۱۹۳۶ء کو ایک اعلان کے ذریعہ یہ بغاوت ختم کر دی گئی۔ بعد میں لارڈ پل کی سرکردگی میں ایک انگریزی کمیشن تحقیق بغاوت کے لیے آیا۔ اعلیٰ عرب کمیٹی نے اس کمیشن کا بائیکاٹ کرنا چاہا مگر عرب سربراہوں کے مشورے سے عرب کمیٹی نے مقاطعہ کا ارادہ ختم کر دیا۔ لارڈ پل کمیشن نے انگریزی حکومت کو جو رپورٹ پیش کی اس میں یہ تجویز کیا کہ فلسطین کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ایک حصہ عربوں کے پاس رہے اور دوسرا یہودیوں کو دے دیا جائے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۳۷ء میں دوبارہ بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے۔ انگریزی حکام نے فوج اور پولیس کی بھاری جمعیت لے کر مفتی صاحب مرحوم کو گرفتار کرنا چاہا۔ چنانچہ فوج اور پولیس دونوں نے مل کر بیت المقدس میں اعلیٰ عرب کمیٹی کے دفتر کا محاصرہ کر لیا۔ اس وقت مفتی صاحب کی صدارت میں کمیٹی کا اجلاس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہو رہا تھا۔ لندن کا اخبار "ٹائمز" ۱۶ جولائی ۱۹۳۷ء کے شمارے میں حکومت برطانیہ کو یہ مشورہ دے چکا تھا کہ "مفتی ہر مسئلے کے حل کے لیے سنگِ راہ بنا ہوا ہے۔ یہودیوں کے ساتھ کسی مفاہمت کو یہ شخص کامیاب نہیں ہونے دیتا۔ اگر مفتی کا خوف نہ ہو تو بہت سے اعتدال پسند فلسطینی لیڈر یہودیوں سے مفاہمت کے لیے تیار ہیں۔ برطانوی حکومت کا فرض ہے کہ وہ مفتی کو آزاد نہ چھوڑے۔ بلکہ اس کا قلع قمع کر دے اور اعلیٰ اسلامی کونسل کی صدارت سے اُسے معزول کرائے۔ نہ صرف اسے بلکہ تمام انتہا پسندوں کی گردن دبوچے۔" ٹائمز کے اسی مشورے کے تحت انگریز ہائی کمشنر فوج اور پولیس کی مدد سے مفتی صاحب کا محاصرہ کر چکا تھا۔ اور محاصرے سے پہلے اس نے حیفا کی بندرگاہ پر ایک بحری جہاز کا انتظام کر رکھا تھا جس سے مفتی صاحب کو ماریشس جلا وطن کیا جانا تھا۔ مگر مفتی صاحب بڑی پھرتی اور دانشمندی کے ساتھ دفتر سے نکل گئے۔ اور مسجد اقصیٰ کے صحن میں پناہ گزین ہو گئے جہاں فلسطینی مجاہدین کی ایک بھاری جمعیت اسلحہ اور سامانِ حرب کے ساتھ پہلے سے جمع تھی۔ اور اس بات پر آمادہ تھی کہ انگریزوں کے ساتھ مسلح تصادم شروع کر دے۔ انگریزی فوج نے مسجد اقصیٰ کے دروازوں کو چاروں طرف سے محصور کر لیا۔ تاکہ جو شخص بھی مسجد سے باہر نکلے اُسے گرفتار کر لیا جائے۔ انگریزی فوج کا محاصرہ اور مجاہدین کی پناہ گزینی مسلسل تین ماہ تک جاری رہی۔ اشیائے خورد و نوش کے سوا کوئی چیز اندر داخل نہ ہو سکتی تھی۔ مفتی صاحب تمام دنیا سے کٹ چکے تھے۔ انگریزی فوج کے لیے یہ آسان نہ تھا کہ مسجد میں داخل ہو کر داروگیر کا سلسلہ جاری کرے۔ مفتی صاحب مرحوم نے اپنی ڈائری میں اس واقعہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

- انگریزوں نے پریشان ہو کر آخر کار یہ تدبیر اختیار کی کہ وہ ہندی مسلمانوں پر مشتمل ایک فوجی دستہ بیت المقدس لائیں، تاکہ وہ دستہ مسجد میں گھس کر مجھے اور دوسرے مجاہدین کو گرفتار کرے[1]۔

---

[1] انگریز فوجی مسجد اقصیٰ میں گھسنے کی ہمت نہ رکھتے تھے۔ اسی لیے وہ مسلمان فوجیوں کو لائے۔ اور وہ بھی ہندوستان کے مسلمان فوجی۔ کسی اور مسلمان قوم کے فوجی اس بارے میں اُن سے تعاون کے لیے تیار نہ تھے۔ ہندوستان کے مسلمان فوجیوں کو آقا کی وفاداری میں ان باتوں کی پروا نہ تھی۔ بیت اللہ پر گولی چلانے کے لیے بھی ان کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ مفتی صاحب مرحوم جو ہمیشہ ہندی مسلمانوں کے مدّاح رہے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمان فوجیوں کا یہ کارنامہ اپنی ڈائری میں غالباً اس لیے ثبت کر دیا ہے کہ وہ کہنا یہ چاہتے ہیں: خوگر حمد سے تھوڑا سا گلا بھی سن لے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چونکہ اس اقدام سے خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے تھے اور جانی نقصان بھی غیر معمولی پیش آسکتا تھا، اور خاص طور پر یہ کارروائی ایسی مسجد میں مسلمانوں کے ہاتھوں پیش آتی جس کا تقدس، دینی حیثیت اور تاریخی اور اثری قیمت بہت عظیم ہے، اس لیے میں نے طے کر لیا کہ میں محاصرہ کرنے والے سپاہیوں کو کسی طرح چیر کر نکل جاؤں، اور کسی ہمسایہ ملک میں جا پناہ لوں۔ جہاں کام کی آزادی ہو اور تحریک جہاد و آزادی کو برقرار رکھا جائے جو اب تقسیم فلسطین کی انگریزی تجویز کے بعد دوبارہ قوت کے ساتھ شروع ہونے والی تھی۔"

مفتی صاحب کمال ہوشیاری سے محاصرہ چیر کر نکل گئے۔ نہ صرف انگریز فوجی انگشت بدنداں رہ گئے بلکہ پوری مغربی صحافت محو حیرت رہ گئی۔ مفتی صاحب بیت المقدس سے نکل کر ایک چھوٹی سی بادبانی کشتی کے ذریعہ لبنان پہنچ گئے۔ مفتی صاحب مرحوم نے بیت المقدس سے کر بیروت تک یہ بری اور بحری سفر جس تکلیف اور قلق اور خطر انگیزی کے عالم میں کیا۔ وہ نہ صرف ایک دلچسپ داستان ہے بلکہ یہ ان کے عزم و ہمت اور ایمان و ایقان کی ایک منہ بولتی تصویر ہے۔ مفتی صاحب مرحوم کا بیان ہے کہ "بیروت میں مجھ سے لندن سے ڈیلی ایکسپریس نے بذریعہ ٹیلیفون رابطہ قائم کیا اور مجھے بیس ہزار ڈالر کی خطیر رقم پیش کی کہ میں اخبار کو صرف یہ بتا دوں کہ وہ کونسا طریقہ ہے جسے میں اختیار کر کے ایسے شدید محاصرے میں سے نکل آیا ہوں۔ لیکن میں نے ایک تو حمیت کے پیش نظر یہ پیشکش ٹھکرا دی اور دوسرا اس خیال سے کہ ابھی مسئلہ فلسطین نازک مرحلے سے گذر رہا ہے اور یہودی اور استعماری دشمن تعاقب میں ہیں اس لیے شاید مجھے آئندہ بھی ایسی خطر انگیزی کی ضرورت پیش آجائے۔ بلکہ بالفعل میں اس طریقہ کو بار ہا اختیار کرنے پر مجبور رہا۔" انگریزوں کو جب یہ اطلاع ملی کہ مفتی صاحب بیروت پہنچ گئے ہیں تو انہوں نے فرانسیسی حکام سے رابطہ قائم کر کے مفتی صاحب کو اپنی تحویل میں لینا چاہا مگر لبنان کے مسلم عوام اور دینی اور سیاسی رہنماؤں نے اس کے خلاف شدید مظاہرات کیے جن کی وجہ سے فرانس نے انگریزوں کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ مفتی صاحب دوسری جنگ عظیم کے شروع تک لبنان میں رہے۔ اور عرب رہنما اور مجاہدین ان سے وہاں جا کر ملتے رہے۔ اور اپنی تحریک کو ہر طرح جاری رکھنے کے لیے کوشاں رہے۔

بیت المقدس سے مفتی صاحب کا خروج کوئی اچانک اور شخصی فیصلہ نہ تھا بلکہ یہ تحریک آزادی کے رہنماؤں کے مشورے کے تحت ہوا تھا۔ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے، یہ نئی بغاوت پل کمیشن کی اس تجویز کے خلاف بھڑکی تھی کہ فلسطین کو تقسیم کر دیا جائے۔ یہ نئی بغاوت یا تحریک آزادی نے یکایک شدت اختیار کر لی اور مجاہدین فلسطین

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور انگریزی فوج دونوں طرف سے جانی اور مالی نقصانات کی خبروں نے اسے مزید تیز کر دیا۔ چنانچہ انگریزوں نے مسجد اقصیٰ میں پناہ لینے والے اور دوسرے متعدد فلسطینی مجاہدین کو گرفتار کر کے جزیرہ سیشل میں جلاوطن کر دیا۔ اور جب صوبہ الجلیل کا گورنر ایک فلسطینی مجاہد کے ہاتھوں مارا گیا تو انگریزوں نے اس کے بعد فلسطین کی تمام تنظیموں کو توڑ دیا، وسیع پیمانے پر گرفتاریاں شروع کر دیں اور اعلیٰ اسلامی کونسل کا نظم بھی ختم کر دیا اور اسے ایک تین رکنی کمیٹی کے حوالے کر دیا جس کے دو رکن انگریز تھے اور اس کا صدر مسٹر کرکبرائڈ تھا۔ ان حالات کو دیکھ کر مجاہدین کی تنظیموں نے خفیہ اجلاسوں کے ذریعہ یہ فیصلہ کیا کہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو یکایک ملک گیر بغاوت کی آگ بھڑکا دی جائے۔ اس بغاوت کا مرکز شام میں تجویز کیا گیا اور مفتی صاحب کو مشورہ دیا گیا کہ وہ بیت المقدس سے نکل کر لبنان جائیں اور وہاں سے دمشق پہنچ کر مرکز تحریک کی قیادت ہاتھ میں لیں مفتی صاحب جب لبنان پہنچ گئے تو انہوں نے بارہا دمشق داخل ہونے کی کوشش کی۔ فرانسیسی حکام نے انہیں پہلے انگریزوں کے سپرد کر دینا چاہا اور بعد میں عوامی مظاہروں کے پیش نظر انہیں لبنان میں ذوق نامی ایک گاؤں میں رہنے پر مجبور کر دیا گیا۔ اس گاؤں میں مفتی صاحب کو رہنما آکر ملتے رہے اور تحریک کا لائحہ عمل سوچتے رہے۔

۱۹۳۹ء میں جب دوسری عالمگیر جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے تو برطانیہ نے دوبارہ فرانس پر یہ دباؤ ڈالا کہ مفتی صاحب مرحوم کو انگریزوں کے سپرد کر دیا جائے۔ لبنان چونکہ فرانس کے زیر تسلط تھا اس لیے انگریز فرانس کی منظوری کے بغیر مفتی صاحب پر ہاتھ نہ ڈال سکتے تھے۔ مفتی صاحب کو جب اس اندرونی گفت و شنید کا علم ہوا تو وہ لبنان سے بغداد ہجرت کر گئے اور یہ سفر بھی انہوں نے جس خفیہ طریقے سے اور طرح طرح کے مصائب کے ساتھ کیا ہے۔ وہ ان کے غیر معمولی جرأت کا آئینہ ہے۔ ۱½ سال تک بغداد میں مقیم رہے۔ مفتی صاحب کے علاوہ اور بھی بہت سے فلسطینی قائدین بغداد میں پناہ لے چکے تھے۔ اور بغداد کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنا رہے تھے۔ کیونکہ عراق انگریزی نفوذ اور فلسطین میں انگریزی سامراج اور صیہونی تسلط پر شدید ردعمل کا اظہار کر رہا تھا۔ مفتی صاحب مرحوم جب بغداد پہنچے تو اس وقت عراق میں نوری السعید کی وزارت قائم تھی۔ نوری السعید انگریزوں کا خیر خواہ تھا۔ اور پوری قوم اور عراقی رہنماؤں کی غالب اکثریت کے برعکس انگریزوں کی سیاست کے لیے راستہ ہموار کر رہا تھا۔ مفتی صاحب ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو عراق میں داخل ہوئے اور ۲۹ مئی ۱۹۴۱ء کو انہوں نے عراق ترک کر دیا۔ عراق کا یہ دور شدید خلفشار اور عراقی اور انگریزی کشمکش کا دور تھا۔ ۱۹۳۰ء کے معاہدہ کی رو سے انگریزی فوج کو عراق کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے تھی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مگر انگریز جیسا کہ وہ عہد شکنی، منافقت اور محسن کشی میں مشہور ہے اس معاہدے کی پابندی سے اپنے آپ کو بالا سمجھ رہا تھا۔ عراق میں انگریزی فوج کے دو بڑے اڈے تھے۔ ایک حبانیہ کی چھاؤنی جو بغداد سے چند میل کے فاصلے پر تھی اور دوسری شعیبہ کی چھاؤنی جو بصرہ سے متصل واقع تھی۔ عراقی عوام، عراقی فوج اور اکثر عراقی رہنما انگریزوں کی بار بار معاہدہ شکنی سے پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ مفتی مرحوم نے اس دور میں عراق کے مختصر عرصۂ قیام کے اندر متعدد خدمات سرانجام دیں:

جب نوری سعید کی وزارت کے بعد رشید عالی کیلانی کی وزارت قائم ہوئی تو مفتی صاحب نے رشید عالی کیلانی سے مل کر جو ان کے گہرے دوستوں میں سے تھا، عراق میں موجود فلسطینی مجاہدین کی عسکری تربیت کا انتظام کیا۔ اور اس تربیت کے بعد فلسطینی مجاہدین کا خاصا مضبوط فوجی دستہ وجود میں آگیا۔ ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی۔ عراقی رہنماؤں کے اندر اس معاملے میں اختلاف پیدا ہو گیا کہ آیا عراق کو جنگ سے الگ رہنا چاہیے یا اتحادیوں اور محوری طاقتوں میں سے کسی ایک طاقت کا ساتھ دینا چاہیے۔ نوری سعید اور اس کے انگریز نواز دوست انگریزوں کی خواہش اور طلب کے تحت عراق کو انگریزوں کا دُنبالہ بنانا چاہتے تھے۔ اور عراقی فوج کو اتحادیوں کے ساتھ مل کر جنگ میں جھونکنا چاہتے تھے۔ جب کہ عراقی فوج اور رشید عالی کیلانی کا گروہ انگریزوں کے خلاف تھے، بلکہ اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر انگریزوں کی بیخ کنی کرنا چاہتے تھے جو عراق پر بھی مکمل استیلاء کے منصوبے بنا رہے تھے اور فلسطین و شرق اردن میں بھی اپنا اقتدار قائم کر رہے تھے۔ چنانچہ نوری سعید نے اپنے دورِ وزارت میں جرمنی اور اٹلی کے ساتھ تعلقات ختم کر لیے۔ مگر عراق میں اس کے خلاف احتجاج ہوا۔ رشید عالی کیلانی کو وزارت بنانے کی دعوت دی گئی تو اس نے جرمنی اور اٹلی سے تعلقات بحال کر لیے جو انگریزوں کے لیے ایک شدید صدمہ تھے۔ اس مسئلے میں عراقی رہنماؤں میں اختلاف بڑھ گئے۔ مفتی صاحب مرحوم نے اپنی دانشمندی اور حکمت کاملہ کے ذریعے متنی سب فریقوں میں صلح کرا دی۔ چنانچہ رشید عالی کیلانی وزیراعظم اور نوری سعید وزیر خارجہ مقرر ہوئے اور اس نازک موقع پر ملکی صفوں میں اتحاد کی فضا پیدا ہو گی۔

ان کوششوں کے ساتھ ساتھ مفتی صاحب مرحوم نے عراق کی ایک اور لحاظ سے بھی قابل قدر خدمت سرانجام دی۔ عراق اور سعودی عرب کے تعلقات خراب چلے آ رہے تھے۔ اور بعض ایسے قبائل عراق میں موجود تھے جیسے قبائل شمّر اور قبائل زبیر جن کی شاخیں سعودی عرب میں آباد تھیں۔ قبائلی روابط

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے ہوتے ہوئے دونوں حکومتیں تعلقات کی پراگندگی برداشت نہ کرسکتی تھیں اور روزانہ طرح طرح کی پیچیدگیاں جنم لے رہی تھیں۔ مفتی صاحب مرحوم اس موقع پر آگے بڑھے اور انہوں نے ایک طرف عراقی حکومت کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ سلطان ابن سعود سے اپنے اختلافات ختم کردے اور دوسری طرف ایک وفد کے ذریعہ سلطان ابن سعود کو مصالحت پر راضی کیا۔ چنانچہ مفتی صاحب کی مساعی بارآور ہوئیں اور دونوں حکومتوں کے درمیان مستقل طور پر تعلقات استوار ہوگئے۔ اس سے پہلے مفتی صاحب سلطان ابن سعود اور امام یمن کے درمیان مصالحت کا عظیم کام سرانجام دے چکے تھے۔ اصلاح ذات البین اسلام کی عظیم ترین خدمات سے ایک خدمت ہے۔

رشید عالی کیلانی اور دوسرے مخلص عراقی رہنماؤں نے جب انگریزی فوج کی مزاحمت کا فیصلہ کیا تو مفتی صاحب مرحوم نے فلسطینی مجاہدین سمیت باقاعدہ ان سے تعاون کیا۔ انگریزوں نے انڈین آرمی کی ایک بڑی تعداد عراق بھیج دی تھی۔ ۱۸ اپریل کو یہ آرمی عراق میں داخل ہوئی۔ عراقی حکومت نے اسے معاہدے کی خلاف ورزی سمجھا اور انڈین آرمی کو عراق میں داخل ہونے سے روکا۔ یہ مزاحمت بڑھتے بڑھتے جنگ کی شکل اختیار کر گئی۔ ۲ مئی ۱۹۴۱ء کو انگریزوں نے عراقی فوج پر حملہ کردیا۔ ۲۷ مئی ۱۹۴۱ء کو بغداد پر چڑھائی کردی۔ عراقی فوج نے بغداد خالی کردیا اور عراق کے شمال میں پہاڑی علاقے کو اپنا مرکز بنا لیا۔ مفتی صاحب مرحوم باقاعدہ فوج کے ساتھ لڑتے رہے۔ اور فوج کے ساتھ ہی شمالی علاقے کی جانب چلے گئے۔ انگریز ان کے پہلے ہی سے درپے تھے اب ان کی تلاش مزید ہونے لگی۔ چنانچہ مرحوم نے ۲۹ مئی ۱۹۴۱ء کو عراق سے ایران نکل گئے۔ عراق کا عرصۂ قیام بھی مرحوم نے نہ صرف مسئلۂ فلسطین کی خدمت میں گزارا بلکہ عراق کی خدمت میں بھی بھرپور طریقے سے حصہ لیا۔ جمال الدین افغانی جہاں جاتے تھے فکری جنگ لڑتے تھے۔ امین الحسینی جہاں گئے سیف وسنان سے دشمن کا مقابلہ کیا۔ مرحوم نے جرمن لیڈروں سے اپنے تعلقات کو استعمال کیا۔ اور عراق میں بیٹھے ہوئے ان سے روابط قائم کیے، اور انہیں خطوط لکھ کر عربوں کی مدد کے لیے اکسایا۔ چنانچہ اسی زمانے میں ہٹلر اور جرمنی کی وزارت خارجہ کے ساتھ مفتی صاحب کی جو مراسلت ہوئی ہے وہ آج بھی مفتی صاحب کی ڈائری میں حرفاً حرفاً موجود ہے۔

عراق پر انگریزوں کی چیرہ دستی کے بعد مفتی صاحب مرحوم کے لیے اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ کسی اور ملک کی طرف کوچ کرجائیں۔ چنانچہ وہ ایران روانہ ہوگئے۔ ایران اور عراق کے باہمی تعلقات خوشگوار تھے۔ ایرانی حکومت عراق سے فرار ہوکر آنے والوں کو پناہ دے رہی تھی۔ بغداد سے طہران تک ان کا سفر بھی نہایت

© rasailojaraid.com

مخدوش حالات میں ہوا۔ انگریزی جاسوس مفتی صاحب کے تعاقب میں تھے اور مفتی صاحب ہر موقع پر ان کو طرح دے جاتے تھے۔ ایران جاکر انہیں معلوم ہوا کہ روس اور جرمنی میں اختلاف برپا ہو چکا ہے اور اس کے اثرات ایران پر بھی فوری عکس انداز ہو رہے ہیں۔ ایران کے اندر چار سو جرمن ماہرین مختلف کارخانوں میں کام کرتے تھے۔ چنانچہ برطانیہ اور روس دونوں حلیف حکومتوں نے ایران کو الٹی میٹم دیا کہ یہ جرمن ماہرین جاسوس ہیں انہیں برطانیہ اور روس کے حوالے کیا جائے۔ رضا پہلوی مرحوم کی حکومت نے جواب دیا کہ یہ لوگ اہل فن ہیں، ان کا امور سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے اور حکومت ان سے کسی حال میں بے نیاز نہیں ہو سکتی۔ مگر اتحادیوں نے اپنے رویے پر اصرار کیا اور ایران اپنے موقف پر ڈٹا رہا۔ چنانچہ ایران پر اتحادیوں کے حملے کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ اس صورتِ حال نے مفتی صاحب کے لیے ایران کو "پناہ گاہ محترم" نہ رہنے دیا۔ ایرانی حکام کے ساتھ مفتی صاحب مرحوم ۱۹۲۴ء سے اپنے تعلقات استوار کیے ہوئے تھے اور مسئلہ فلسطین پر بارہا ان کی ہمدردیاں حاصل کر چکے تھے اور ان کے نتیجے میں ایران کے وزیر خارجہ سید باقر الکاظمی ۱۹۳۳ء میں اور ایران کے وزیر اعظم و وزیر خارجہ فروغی ۱۹۳۷ء میں مسئلہ فلسطین لیگ آف نیشنز میں پیش کر چکے تھے۔ مفتی صاحب مرحوم ایران میں محض ایک سیاسی پناہ گزین کی حیثیت سے داخل ہونے کے بجائے ایران کے بہی خواہ کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ وہ ایران میں قدم رکھتے ہی ایران کے وزیر خارجہ آغائے عامری سے ملے۔ اور انہیں بتایا کہ انگریز ایران پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس امر کی اطلاع مفتی صاحب مرحوم کو عراق کے کرنل مرحوم صلاح الدین صباغ نے دی تھی۔ کرنل صلاح الدین صباغ عراقی مندوب کی حیثیت سے اس اجتماع میں شریک ہوئے تھے جو اتحادیوں نے ۱۹۴۰ء میں جنرل ویگان کی صدارت میں منعقد کیا تھا۔ جنرل ویگان ان دنوں مشرق اوسط میں اتحادی فوجوں کا کمانڈر تھا۔ اس اجتماع میں ایران پر قبضہ کرنے کے لیے مفصل منصوبہ تیار کیا گیا تھا۔ کرنل صلاح الدین صباغ مرحوم نے عراق واپس آکر اس منصوبے سے مفتی صاحب مرحوم کو آگاہ کیا اور حملے کا نقشہ بھی انہیں تیار کر دیا تاکہ مفتی صاحب اس منصوبے سے ایرانی حکام کو بروقت آگاہ کر دیں۔ مفتی صاحب نے اتحادیوں کی اس سازش سے اور اس نقشۂ جنگ سے جس میں ان راستوں کی نشاندہی کی گئی تھی جن سے برطانوی فوجیں ایران کے جنوب اور مغرب سے حملہ آور ہونے والی تھیں وزیر خارجہ ایران کو باخبر کر دیا۔ وزیر خارجہ نے جواب دیا کہ انگلستان کے ساتھ تو ہماری کوئی عداوت نہیں ہے۔ اس لیے مجھے انگریزوں کی طرف سے ایران پر جارحیت کی توقع نہیں ہے۔ مگر چند ہفتے نہ گزرنے پائے تھے کہ برطانیہ نے ایران پر حملہ کر دیا اور عین اسی نقشے کے مطابق کیا جسے مفتی صاحب آغائے عامری

© rasailojaraid.com

کو بتا چکے تھے۔

ایران میں مفتی صاحب مرحوم کا قیام خطرے سے خالی نہ تھا۔ انہوں نے اپنے دیگر ساتھیوں سمیت ترکی سفیر کے ذریعہ ترکی جانے کی اجازت طلب کی۔ مگر انقرہ سے یہ اطلاع آئی کہ رشید عالی کیلانی اور دوسرے لوگوں کو اجازت ہے۔ مگر مفتی صاحب اور ان کے اہل وعیال کو انقرہ اس وقت سیاسی پناہ نہیں دے سکتا۔ اتحادیوں کے ایران پر حملے سے بعد مفتی صاحب اور دوسرے فلسطینی مجاہدوں نے اپنے قیام کے بارے میں وزیر خارجہ ایران سے دوبارہ ملاقات کی۔ وزیر خارجہ نے کہا کہ "آپ لوگ اطمینان سے ایران میں رہیں۔ ایران اس قدر حمیت سے خالی نہیں ہے کہ آپ لوگوں کو دشمنوں کے حوالے کر دے"۔ بایں ہمہ مفتی صاحب مرحوم اور اُن کے ساتھی ایران میں اس طرح رہتے رہے کہ خود ایرانی حکام کو بھی ان کے ٹھکانے کا علم نہ تھا۔ اگست ۱۹۴۱ء میں طہران پر برطانوی بمبار منڈلانے لگے اور لوگوں کے اندر خوف وہراس پیدا ہو گیا۔ مفتی صاحب مرحوم نے افغانستان میں پناہ لینے کا ارادہ کر لیا۔ افغانی سفیر کے ذریعے حکومت افغانستان نے مفتی صاحب کو جواب دیا کہ "ہم آپ اور آپ کے ساتھیوں کا کابل میں خیر مقدم کریں گے"۔

افغانستان کے وزیر خارجہ فیض محمد خان سے مفتی صاحب ۱۹۳۳ء میں سفر ہند کے دوران متعارف ہو چکے تھے۔ اور اس وقت سے دونوں کے درمیان دوستانہ تعلقات چلے آ رہے تھے۔ بلکہ انہی دنوں فیض محمد خان نے مفتی صاحب مرحوم سے یہ شکوہ کیا تھا کہ عراق اور مصر نے ابھی تک افغانستان سے سفارتی تعلقات قائم نہیں کیے۔ چنانچہ مفتی صاحب مرحوم نے رشید عالی کیلانی جو ان دنوں عراق کے وزیر اعظم تھے، سے مل کر کابل میں عراق کا سفیر بھجوایا اور اسی طرح مصر کے وزیر اعظم حسن صبری پاشا کو بھی اس سلسلے میں ایک خط لکھا۔ اور مصر اور افغانستان میں سفراء کا تبادلہ کروایا۔ مفتی صاحب مرحوم افغانوں کے زندگی بھر مداح رہے ہیں۔ افغانوں کی شہامت وشجاعت کے وہ بڑے دلدادہ تھے۔ فقیر ایپی کے ساتھ ان کے تعلقات تھے۔

مرحوم افغانستان جانے کے لیے پر تول رہے تھے۔ مگر انہیں شبہ ہوا کہ افغانستان کے سفارت خانے کا ایک ملازم برطانیہ کا جاسوس ہے۔ اور اس نے یقیناً ان کے سفر افغانستان سے انگریزی حکام کو آگاہ کر دیا ہوگا۔ اس شک کی بنا پر مفتی صاحب نے افغانستان جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ مفتی صاحب مرحوم بڑے زیرک اور صاحب بصیرت انسان تھے۔ ان کا شک درست نکلا۔ یہ ملازم ہندی الاصل تھا اور غالباً قادیانی تھا، اور انگریزوں کا جاسوس تھا۔ اس کے بعد مفتی صاحب طہران میں کسی خفیہ مقام پر ٹھیرے رہے۔ اور افغانستان کے بجائے انہوں نے اب چھپ چھپا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کر ترکی جانے کا ارادہ کرلیا۔ جہاں تک انگریزوں کی طرف سے ان کی تلاش کا تعلق ہے، اُن کے سراغ رسانی کے محکمے کوئی کسر اُٹھا رہے تھے۔ ۲۹ راگست کو ایرانی دارالحکومت پر انگریز اور روسی دونوں افواج کا قبضہ ہوچکا تھا۔ رضا پہلوی کا خاندان پہلے ہی طہران سے اصفہان جا چکا تھا۔ طہران پر اتحادی قبضہ کے بعد انگریزوں اور ایرانی نمائندوں کے درمیان گفت و شنید شروع ہوئی اور انگریزوں نے رضا پہلوی کو آمادہ کیا کہ وہ واپس طہران آجائیں اور حکومت سنبھال لیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مگر اب ایرانی حکومت آزاد نہ تھی بلکہ اتحادیوں کی غلام تھی۔ اس کے نتیجے میں مفتی صاحب کا وہ تحفظ بھی ختم ہوگیا جو انہیں سابقہ حکومت کے تحت حاصل تھا۔ گو نئی حکومت نے ان تمام عربوں کو یقین دلا دیا تھا کہ انہیں کوئی خطرہ نہیں ہوگا مگر یہ صرف انگریزوں کی ایک روایاتی فریب کاری تھی۔

برطانوی فوج کے ڈی کمانڈر مارشل ویول نے طہران میں داخل ہوتے ہی یہ اعلان کیا کہ "جو شخص مفتی امین الحسینی کو پکڑ کر لائے گا یا ایسی معلومات فراہم کرے گا جن کی مدد سے انہیں زندہ گرفتار کیا جاسکتا ہو یا مُردہ اُسے ۲۵ ہزار اسٹرلنگ پونڈ انعام دیا جائے گا۔" اس اعلان کے بعد نہ صرف انگریزی جاسوس بلکہ خود ایرانی پولیس کے انسپکٹر جنرل آقائے مقدادی بھی مفتی صاحب کا سراغ لگانے میں منہمک ہوگئے۔ مارشل ویول نے شاہ رضا پہلوی سے ذاتی طور پر ملاقات کی اور ان سے مفتی صاحب کی گرفتاری کا مطالبہ کیا۔ مفتی صاحب نے حالات کی نزاکت کا اندازہ کرلیا اور ترکی کا رخ کرلیا۔ راستے میں پہاڑی علاقوں کے اندر شدید سردی تھی اور یہ مجاہد تہی دست تھا، گرم لباس بھی پاس نہ تھا۔ شمالی علاقوں پر جہاں سے اُسے گزرنا تھا روسی افواج قابض تھیں۔ الغرض مرحوم تحقیق و تعاقب کے کٹھن اور خطرناک مراحل عبور کرتے ہوئے دو ہفتوں کے پُرصعوبت سفر کے بعد خفیہ طور پر ترکی میں پہنچ گئے۔ صرف اللہ کی ذات انہیں ہر مقام پر دشمنوں کی دسترس سے بچاتی رہی۔ اور لطف یہ ہے کہ مفتی صاحب استنبول میں تھے اور برطانیہ کا وزیر خارجہ مسٹر ایڈن ایوانِ نمائندگان میں ایک ممبر کے سوال کا جواب دیتے ہوئے ایوان میں یہ اعلان کر رہا تھا کہ۔

"مفتی جو برٹش امپائر کا دشمن نمبر ایک ہے، ہمارے قبضے میں آچکا ہے، طہران میں وہ جس مکان میں چھپا ہوا تھا اُسے اب ہماری فوجوں نے گھیرے میں لے رکھا ہے۔"

مرحوم اپنے اہل و عیال کو ایران ہی چھوڑ گئے۔ بلکہ یہ جہاں جاتے تھے تنہا ہوتے تھے۔ ان کے اہل خانہ بعد میں اُن سے آملتے تھے۔ ایران میں اُن کے خاندان والوں کے ساتھ شدید بدسلوکی کی گئی۔ طہران میں مفتی صاحب کی خفیہ رہائش گاہ کو جہاں سے مفتی صاحب کچھ روز پہلے نکل چکے تھے محصور کرلیا گیا۔ اُن کے اہل خانہ جو دس افراد پر مشتمل تھے اور ان میں ۳ سال تک کی کم عمر بچی بھی تھی، اس جگہ ابھی موجود تھے۔ چنانچہ انہیں گھر سے نکلنے سے روک دیا گیا۔ اور ایک ماہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تک انہیں وہیں نظر بند رکھا گیا۔ اس کے بعد فوجی پہرے کے اندر انہیں ایران کے جنوب میں اہواز کی جیل میں ڈال دیا گیا۔ یہ جیل عادی مجرموں کے لیے مخصوص تھی۔ مفتی مرحوم کے اہل و عیال اسی اندھی جیل کے ایک چھوٹے سے کمرے میں مقفل کر دیئے گئے۔ چنانچہ ۵۲ روز تک یہ مجاہد خاندان عذاب و اذیت کے جہنم میں پڑا رہا۔ اس کے بعد انہیں ٹرک کے ذریعہ بصرہ منتقل کر دیا گیا۔ بصرہ کا راستہ کچّا اور تکلیف دہ تھا۔ سات گھنٹے تک ٹرک مسلسل سفر کرتا رہا اور یہ خاندان بصرہ پہنچا تو بے حد مضمحل ہو چکا تھا۔ بصرہ میں انہیں پہلے روز پولیس اسٹیشن میں رکھا گیا اور پھر ٹرین کے ذریعہ بصرہ سے بغداد روانہ کر دیا۔ بصرہ سے بغداد کا فاصلہ ۳۶۰ میل کے قریب ہے۔ انہیں تیسرے درجے میں سفر کرایا گیا۔ بغداد میں لے جا کر انہیں ایک رات کے لیے پولیس اسٹیشن میں ٹھہرایا گیا اور پھر اگلے روز بغداد سے بیت المقدس بھیجنے کا حکم جاری ہوا۔ اور یوں آرام کیے بغیر انہیں چھ سو میل صحرائی سفر کے لیے تیار رہنے کا حکم دیا گیا مگر بچوں نے انکار کر دیا اور سخت واویلا کیا۔ بغداد کے لوگوں کو جب اس امر کا علم ہوا تو انہوں نے بھی شدید احتجاج کیا۔ چنانچہ حکام نے حالات کی نزاکت بھانپ کر بچوں کو بغداد میں مفتی صاحب کے سابق مکان میں رہنے کی اجازت دے دی۔ وہاں ان کا علاج کیا گیا اور پھر چند روز کے وقفے کے بعد انہیں بغداد سے بیت المقدس بھیج دیا گیا۔

ترکی کی فضا مفتی صاحب کے لیے اب سازگار نہ تھی۔ گو وہ یہاں کافی مدّت رہ گئے تھے۔ بلکہ عثمانی فوج کے اندر ایک افسر کے عہدے تک فائز رہے تھے۔ مگر گردشِ احوال سے اب اسی مجاہد کے لیے ترکی کی زمین بھی تنگ ہو رہی تھی۔ خود مفتی صاحب مرحوم کے الفاظ میں: "ضاقت علینا الارض بما رحبت" (زمین اپنی کشادگی کے باوجود ہمارے لیے تنگ ہو چکی تھی)۔ چنانچہ انہوں نے استنبول سے صوفیا کی گاڑی لی اور بلغاریا کو چل دیئے۔ بلغاریا سے رومانیا گئے اور رومانیا سے ہنگری ہوتے ہوئے اٹلی داخل ہو گئے۔ اٹلی میں اُن کے جانے کا مدّعا یہ تھا کہ وہ دونوں محوری طاقتوں سے مل کر عرب ممالک کی آزادی کی جدوجہد کریں۔ مرحوم جب عراق اور ایران میں تھے تو ان طاقتوں کے ساتھ اُن کا رابطہ تھا۔ اور عربوں کی آزادی کے لیے ان طاقتوں کو آمادہ کیا جا رہا تھا۔ مفتی صاحب جب روم پہنچے تو اٹلی حکومت کو ان کی آمد کا علم ہو گیا۔ چنانچہ اٹلی کی وزارت خارجہ اور جرمنی کے سفارت خانے نے ان سے رابطہ قائم کیا۔ اس کے بعد مفتی صاحب مرحوم کی اٹلی کے حکمران موسولینی سے ملاقات ہوئی۔ موسولینی نے مفتی صاحب کا پُرجوش خیر مقدم کیا۔ اور کہا کہ میں آپ کا اپنی طرف سے اور اپنی قوم کی طرف سے خیر مقدم کرتا ہوں۔ اور دشمنوں کے ہاتھوں نجات پا جانے پر آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ مفتی صاحب مرحوم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے اس ملاقات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے موسولینی کے سامنے عربوں کی آزادی کا مطالبہ رکھا اور فلسطین کو یہودیوں کی سازش سے بچانے کی درخواست کی۔ موسولینی نے نہ صرف مفتی صاحب کو پوری پوری تائید کا یقین دلایا بلکہ جیسا کہ مفتی صاحب نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے یہاں تک اس نے کہا: "میں نے قرآن اور اسلامی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے اور مجھے معلوم ہے کہ اسلام کے اندر بڑی رواداری ہے لیکن یہودی اس رواداری سے محروم ہیں"۔ مفتی صاحب اس ملک میں غریب الدیار تھے اور نہایت بے بسی کے عالم میں یہاں پہنچے تھے۔ اور موسولینی اور ہٹلر کو صرف اس اصول کی نظر سے دیکھتے تھے کہ: "عدو عدوك صديقك" (دشمن کا دشمن تیرا دوست ہے)۔ اگر مرحوم نے ایک غیور اور جری مسلمان ہونے کی حیثیت سے اپنا یہاں بھی فرض دینی ادا کیا۔ اٹلی کی وزارت خارجہ کی طرف سے مفتی صاحب کے اعزاز میں ضیافت کا اہتمام کیا گیا۔ مفتی صاحب نے اس موقع پر وزارت خارجہ کے نمائندے پر واضح کر دیا: "اٹلی نے لیبیا پر ناجائز قبضہ جما رکھا ہے اور وہاں سامراجی ہتھکنڈے اختیار کر رکھے ہیں۔ یہ رویہ عربوں کے لیے بالخصوص اور مسلمانوں کے لیے بالعموم اٹلی پر اطمینان و اعتماد میں حائل ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا"۔ وزارتِ خارجہ کے نمائندے نے اعتراف کیا کہ اٹلی نے اس بارے میں شدید غلطی کی ہے، اور اس اقدام سے اٹلی کو عربوں اور مسلمانوں کی عداوت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا اور حالیہ جنگ کے بعد ہم اس رویے میں لازماً تبدیلی کریں گے"۔

اٹلی میں مختصر عرصہ کے قیام کے بعد مفتی صاحب جرمنی تشریف لے گئے۔ جرمنی میں رہ کر انہوں نے مسئلہ فلسطین، عربوں کی آزادی اور یہودی سازشوں سے مسلمانوں کو نجات دلانے کے لیے جو کوششیں سرانجام دی ہیں وہ ایک مفصل کہانی ہے۔ یہ مختصر سا مضمون اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ جرمنی کی شکست کے بعد مرحوم جرمنی سے فرانس ہجرت کر گئے۔ اور وہاں پہنچتے ہی انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ ۱۹۴۶ء تک وہ فرانس میں قید رہے۔ مرحوم اس قدر مضبوط اعصاب اور عزم و ارادہ کے قوی انسان تھے کہ کٹھن سے کٹھن حالات میں بھی وہ کبھی مایوس اور کم ہمتی کا شکار نہیں ہوئے۔ فرانس کا قید خانہ ان کے ہوش و حواس باختہ کرنے اور اعصاب و ارادہ کو پامال کرنے کے لیے کافی تھا مگر اس فضائے تاریک اور عالم بیکسی کے اندر بھی وہ حیلہ و تدبیر میں عاجز نہیں رہے۔ ۱۹۴۶ء کی ایک رات انہوں نے قید فرانسیس سے نجات پانے کی ٹھان لی۔ چنانچہ ارادہ کو بروئے کار لاتے ہوئے انہوں نے ایک کامیاب تدبیر اختیار کی اور خفیہ طریقے سے جیل سے نکل گئے اور یکایک مصر پہنچ گئے۔ مرحوم جب فرانس کی جیل میں تھے تو ہولناک مستقبل ان کا انتظار کر رہا تھا۔ ان کے گرفتار ہوتے ہی یہودیوں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ مفتی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ابن الحسینی کو نورمبرگ کی عدالت میں پیش کیا جائے اور "جنگی مجرم" ہونے کی حیثیت سے ان پر مقدمہ چلایا جائے۔ یہودیوں کا الزام یہ تھا کہ نازی حکمرانوں نے دوران جنگ یہودیوں کی نسل کشی کی جو مہم چلائے رکھی ہے اُس میں مفتی کا ہاتھ ہے بلکہ مفتی نے ہی نازیوں کو اکسایا تھا کہ یہودیوں کو ختم کر دیا جائے[5]۔ اس زمانے میں یوگوسلاویہ کی حکومت نے بھی مرحوم پر چند الزامات لگائے اور انہیں شدید سزا دینے کا مطالبہ کیا۔ یوگوسلاویہ کا ایک الزام یہ تھا کہ یوگوسلاویہ کے انقلابی دستے نازی فوجوں کے خلاف گوریلا جنگ لڑ رہے تھے۔ مفتی نے ان یوگوسلاوی دستوں کی سرکوبی اور خاتمہ کے لیے بوسنہ کے مسلمانوں پر مشتمل کئی عسکری دستے منظم کیے۔ جنہوں نے یوگوسلاوی انقلابیوں کی کثیر تعداد کو کچل ڈالا[6]۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ قید فرانس کا زمانہ مفتی صاحب مرحوم کے لیے کس قدر زہرہ گداز تھا۔ اِن کوہ آسا مصائب میں بھی وہ بے حوصلہ نہ ہوئے اور اپنی نجات کا راستہ آناً فاناً پیدا کر لیا۔

مفتی صاحب مرحوم کا یوں یکایک نگرانی اور حفاظت کے کوہ گراں کو چیر کر یکایک مصر پہنچ جانا دنیا کا ایک اہم واقعہ سمجھا گیا۔ عالم عرب اور اسلامی ممالک میں اس پر بڑی خوشی کا اظہار کیا گیا۔ مغرب مفتی صاحب کی چابکدستی اور دلبری پر انگشت بدندان رہ گیا۔ برسوں کے بعد یہ مجاہد انسان اب براہ راست اپنے ملک کے مسئلے سے دوبارہ وابستہ ہوگیا۔ چنانچہ مفتی صاحب کے مصر پہنچتے ہی بلودان (شام) میں عرب لیگ کی سیاسی کمیٹی کا اجتماع ہوا اور پھر تمام فلسطینی تنظیموں کے اتفاق سے "اعلیٰ عرب کونسل برائے فلسطین" کی تشکیل کی گئی۔ اور مفتی صاحب مرحوم اس کے بالاتفاق صدر منتخب ہوئے۔ انگریزوں نے مصری حکومت پر شدید دباؤ ڈالا کہ مفتی صاحب کو گرفتار کیا جائے اور انہیں عملی سیاست میں حصہ نہ لینے دیا جائے۔ مگر مصری حکومت عوامی دباؤ کے پیش نظر انگریزوں کا یہ مطالبہ تسلیم نہ کر سکی۔

۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء کو نام نہاد مملکت اسرائیل وجود میں آئی اور اس کا اعلان ہوتے ہی عرب آبادی اور یہودیوں

۵؎ یہودیوں کا یہ الزام بے بنیاد ثابت ہو چکا ہے۔ یہودیوں نے پہلی جنگ عظیم میں جرمنی سے غداری کا ارتکاب کیا تھا اور برطانیہ اور ان کی حلیف طاقتوں کے ساتھ مل کر تخریبی کارروائیاں کی تھیں۔ اس لیے نازی یہودیوں سے از خود انتقام لینے کے لیے تلے ہوئے تھے اور موقع پاتے ہی انہوں نے ان سے بھرپور انتقام لینے کی مہم شروع کر دی۔

۶؎ مفتی مرحوم نے بوسنہ کے مسلمانوں کی مدد سے دو عسکری بریگیڈ تشکیل دیئے تھے۔ ان کا مقصد ان حملوں کا سدباب تھا جو جنرل میخائیل وچ (کمیونسٹ لیڈر) کی قیادت میں سرویا کی تشدد پسند گوریلا تنظیمیں بوسنہ کے مسلمانوں پر پے در پے کر رہی تھیں۔ اور لاکھوں مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار رہی تھیں تاکہ بوسنہ کو سرویا کے اندر مدغم کر سکیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے درمیان جنگ بھڑک اُٹھی ۔ عرب کی طرف سے مجاہدین کی کمان دو مردانِ کار کے ہاتھ میں تھی ۔ ایک مفتی صاحب مرحوم جنہوں نے "جیش الجہاد" کی تشکیل کی اور نامور مجاہد عبد القادر الحسینی کو اس کا قائد اعلیٰ بنایا ۔ یہ جیش فلسطینی نوجوانوں پر مشتمل تھا ۔ اور دوسرے امام حسن البنا شہید تھے ۔ انہوں نے مصر و غزہ کے اخوان المسلمین پر مشتمل ایک زبردست مجاہد تنظیم کی بنیاد ڈالی جس نے یہودیوں کے چھکّے چھڑا دیئے ۔ یہ جنگ ۶ ماہ تک جاری رہی ۔ مجاہدین نے بہت سے علاقے یہودیوں کے قبضے سے چھڑا لیے ۔ یہ جنگ عرب مجاہدین جیت ہی رہے تھے کہ عرب ممالک کی افواج بھی جنگ میں شریک ہو گئیں اور پھر بہت جلد انہوں نے فائر بندی قبول کر کے ایک اچھی کارروائی کو شکست میں تبدیل کر دیا ۔

مفتی صاحب مرحوم اور امام حسن البنا اور دوسرے مخلص رہنما جنگ میں عرب افواج کی شرکت کے خلاف تھے ۔

۱۵ رمئی ۱۹۴۸ء کو عرب افواج میدان میں اُتریں ۔ ایک طرف خود ان افواج کے اندر مسئلہ فلسطین کے بارے میں اختلاف تھا اور دوسری طرف استعماری حکومتیں عرب ممالک پر دباؤ ڈال کر جنگ کو رکوا رہی تھیں ۔ اس کا نتیجہ اُس المناک شکست کی صورت میں پیش آیا جسے آج تک عرب ممالک بھگت رہے ہیں ۔ "اسرائیل" سے دس لاکھ فلسطینی یکایک نکال دیئے گئے اور اب حالات نے ایک اور پہلو سے نزاکت اختیار کی ۔ مفتی صاحب مرحوم نے اس کے بعد بھی اپنی جدوجہد جاری رکھی ۔ ایک طرف وہ فلسطینی مجاہدین کی امداد و آبادکاری کے لیے شبانہ روز لگے رہے ۔ دوسری طرف عالمی سطح پر مسئلہ فلسطین کو زندہ رکھنے اور دنیا کو اُس سے آگاہ کرنے میں مصروف رہے اور تیسری طرف اسلامی ممالک اور دوست حکومتوں کو برابر آزادیٔ فلسطین کے لیے آمادہ کرتے رہے ۔ ۱۹۵۹ء تک وہ قاہرہ رہے ۔ مگر جمال عبدالناصر ان کے وجود کو برداشت نہ کر سکا ۔ مرحوم وہاں سے اُٹھ کر لبنان آ گئے اور لبنان ہی میں وہ اُس وقت تک محوِ جہاد رہے جب تک ان کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز نہیں کر گئی ۔ ۱۹۷۴ء ان کی زندگی کا آخری سال ہے ۔ مگر فروری ۱۹۷۴ء میں وہ لاہور کی اسلامی کانفرنس میں شریک ہوئے ۔ اپریل ۱۹۷۴ء میں وہ مکہ معظمہ میں عالمی اسلامی تنظیموں کی کانفرنس میں شریک ہوئے اور اب جون ۱۹۷۴ء میں کوالالمپور میں مسلم وزرائے خارجہ کی کانفرنس میں شرکت کے متمنی تھے مگر صحت جواب دے چکی تھی ۔ چنانچہ اپنے ایک قدیم رفیق خلیل علیا کو ایک مفصل میمورنڈم دے کر کانفرنس میں بھیجا اور اسپتال میں آخری لمحات تک اس کانفرنس کے نتائج کی پوچھ گچھ کرتے رہے ——— ۴ رجولائی کی شام کو یہ آفتاب جہاد و شجاعت آخر کار ڈوب گیا ۔ مرحوم نے مسلمانوں کے اتحاد ، دنیا کی اسلامی تحریکوں سے تعاون اور علی الخصوص جماعت اسلامی پاکستان کی سرپرستی اور خود پاکستان کی بہبود و بقا کے لیے جو کارنامے سرانجام دیئے ہیں وہ کسی اور فرصت میں بیان کیے جائیں گے ۔

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

© rasailojaraid.com